ڈاکٹر شہباز حسین

پاک سیکرٹریٹ، اسلام آباد

سمیرا انور

پی ایچ ڈی اسکالر، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فیض کی شاعری کی نوتاریخی بازیافت

A New Historicist Rediscovery of the Poetry of Faiz Ahmed Faiz

ABSTRACT:

This article explores the presence of New Historicist elements in the poetry of Faiz Ahmed Faiz, one of the most celebrated voices of Urdu poetry, situating his work within the socio-political and cultural contexts of his time. It examines how Faiz's verse reflects and critiques historical realities, including colonial legacies, the struggle for independence, socio-economic inequalities, political oppression and post partition disillusionment. New Historicism is a theory that emphasized the interplay between literary texts and their historical, cultural and political contexts, arguing that literature cannot be studied in isolation from the power structures and socio-political discourses that shape it. Drawing on the principles of New Historicism, the study highlights the interplay between literature and history in Faiz's poetry, showing how is creative expression engages with power structures, collective memory and resistance. By analyzing selected poems, the article demonstrates how Faiz's literary craft serves as both an artistic and historical document, merging personal emotion with the broader narrative of social and political transformation. Faiz's poetry is enriched with multi elements and domains, and this historical study of his poetry, perfectly unveils and uncovers all that that aspects. Besides, Faiz's poetry exemplifies the profound interconnection between literature and history.

KEYWORDS: New Historicism, Faiz Ahmed Faiz, Urdu Poetry, Literature, history.

نوتاریخیت ایک تنقیدی تھیوری ہے جو کہ ادب اور تاریخ کے باہمی تعلق کو نئی جہت میں دیکھتی ہے، جہاں ادب محض تخلیقی اظہار نہیں بلکہ تاریخی بیانیے کی تشکیل اور چیلنج کا ذریعہ بنتا ہے۔ نوتاریخیت کے اہم مفکر اسٹیفن گرین بلیٹ(Stephen Greenblatt) کے مطابق، کوئی بھی ادبی متن محض جمالیاتی اظہار نہیں بلکہ "ثقافتی مظہر" ہوتا ہے، جو اپنے عہد کی طاقت، سیاست اور نظریاتی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے۔ دراصل نوتاریخیت (New Historicism) ایک مابعد جدید تنقیدی رویہ ہے جس کا مقصد ادبی متون کو ان کے تاریخی، سیاسی، اور سماجی سیاق و سباق میں سمجھنا ہے۔ یہ نظریہ ادب کو تاریخ سے الگ نہیں سمجھتا بلکہ اسے تاریخی ساخت کا حصہ تصور کرتا ہے۔ یہ تھیوری اس بات پر زور دیتی ہے کہ ادب کو ایک فن پارہ نہیں بلکہ ایک تاریخی دستاویز کے طور پر بھی پڑھا جانا چاہیے۔ کیوں کہ ہر ادبی متن اپنے دور کی طاقت، سیاست، مزاحمت اور بیانیے کی عکاسی کرتا ہے۔ ادیب خود بھی ایک تاریخی وجود ہوتا ہے جو اپنی تخلیق میں لاشعوری طور پر اپنے دور کی اقدار اور نظریات کو شامل کرتا ہے۔ دیگر اصنافِ ادب کی طرح شاعری بھی ان تمام خصائص کی حامل ہوتی ہے۔ کسی بھی شاعر یا اس کی تخلیقات کے نوتاریخی مطالعے کے لیے ضروری ہے کہ اسے اس کے تاریخی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی پس منظر میں دیکھا جائے، تاکہ یہ سمجھا جاسکے کہ شاعر اپنے عہد کے تاریخی اور معاشرتی حالات کو کس طور اپنے کلام میں منعکس کرتا ہے۔ کیوں کہ بھی تخلیق کار یا شاعر اپنے عہد سے کٹ کر کوئی فن پارہ یا شاعری تخلیق نہیں کر سکتا۔ اردو شاعری نے مختلف نوآبادیاتی، آزادی کی تحریکوں، جنگوں، فوجی آمریت اور سماجی جبر جیسے ادوار میں جنم لیا۔ اس دور کے شعرا نے اپنی شاعری میں ان تمام عناصر کو سمویا اور یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں اس عہد کی تاریخ، سیاست اور ثقافت کی بھی ایک واضح جھلک نظر آتی ہے۔

فیض احمد فیض بیسویں صدی کے اردو کے عظیم شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ اردو کے ان شعرا میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کو نہ صرف حسن و عشق بلکہ سیاسی و تاریخی شعور سے بھی ہم آہنگ کیا۔ ان کی شاعری برطانوی سامراج، طبقاتی ظلم، جمہوری جدوجہد اور عوامی آزادی کی نمائندہ ہے۔ ان کی شاعری صرف جمالیاتی حسن ہی نہیں رکھتی بلکہ ایک گہرا فکری، سیاسی اور سماجی شعور بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ وہ نہ صرف محبت کے شاعر ہیں بلکہ مزاحمت، آزادی، طبقاتی جدوجہد، امن، انسانی حقوق، ظلم کے خلاف احتجاج اور انقلاب کے بھی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی کا جذبہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہر مظلوم کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں، چاہے وہ کسی بھی نسل، قوم یا مذہب سے ہو۔ ان کی شاعری میں برطانوی استعمار اور اس کے اثرات کا

بیان بھی بڑی شدت اور گہرائی سے ملتا ہے۔انہوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی شاعری میں غلامی کے خلاف آواز بلند کی اور آزادی کو نہ صرف انسان کا بنیادی حق تصور کیا بلکہ اس کے لیے آواز بھی بلند کی:

> ''فیض صاحب حسن و محبت کے شاعر ہیں۔ان کا آدرش دنیا میں حسن و محبت کی فرماں روائی ہے۔زندگی کے حسن سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ، غمِ ذات اور غمِ زمانہ سے ان کا گہرا لگاو،ان کی انسان دوستی اور حب الوطنی،ان کی انقلاب پسندی اور آرزو پسندی سب دردِ عشق ہی کے استعارے ہیں''۔(۱)

اگرچہ وہ ایک ترقی پسند شاعر کے طور پر معروف ہیں،تاہم ان کے کلام کا مطالعہ نوتاریخی تناظر میں کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی شاعری محض جذباتی یا رومانوی اظہار نہیں، بلکہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تاریخی سیاق و سباق سے گہرا رشتہ رکھتی ہے اور اس کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔نوتاریخیت کے مطابق شاعر یا ادیب نہ تو مکمل آزاد ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی تخلیق کسی خلا میں جنم لیتی ہے۔بلکہ وہ اپنے عہد کے گہرے اثرات کا مظہر ہوتی ہے۔فیض کی شاعری اسی نوتاریخی اصول پر پوری اترتی ہے۔ان کی شاعری میں نوآبادیاتی دور کی غلامی،آزادی کی جدوجہد، مارشل لا کا جبر، سیاسی قید و بند، طبقاتی استحصال اور سامراجی مظالم کا گہرا عکس ملتا ہے۔ان کی شاعری میں تاریخ کو وہ کردار بڑے نمایاں ہیں جنہیں روایتی تاریخ نگاری میں نظرانداز کر دیا گیا۔انہوں نے اپنے عہد کی سیاسی، معاشرتی و معاشی ناانصافیوں کو اس طور پر بیان کیا کہ ان کے کلام کو اس زمانے کی زندہ دستاویز کہا جا سکتا ہے۔اس حوالے سے انہیں نوتاریخی شاعر کہنے میں بھی کوئی عار نہیں، کیوں کہ ان کی شاعری کسی ذاتی یا مجرد تجربے کا اظہار نہیں، بلکہ اپنے عہد کی تاریخ، سیاست، آمریت اور سماج کے ساتھ ایک مکالمہ ہے۔وہ ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے تاریخ کو صرف یاد نہیں کیا بلکہ اس سے تنقیدی سوالات کیے اور محروم طبقات کی آواز کو ایک زبان دی۔یہی وہ نکتہ ہے جو فیض کو نوتاریخی تناظر میں ایک اہم اور منفرد مقام عطا کرتا ہے۔اسی حوالے سے ڈاکٹر سفیر اعوان لکھتے ہیں:

> ''فیض کی زندگی اور کیریئر میں سیاسی وابستگی ایک مرکزی مسئلہ رہا ہے۔کیوں کہ ان کے اکثر کام نے طاقت اور سیاسی کنٹرول کے تسلیم شدہ تصورات کی مخالفت کی۔کسی بھی مسئلہ میں فیض کی شمولیت بالآخر اس مسئلے کو سامنے لے آتی۔آج تک فیض کے کام کے حوالے سے ہونے والی بحث میں مرکزی نکتہ رہا ہے کہ آیا فیض محض ایک باغی تھے یا ایک سچے انقلابی؟ان کی شاعری میں ملتے جلتے شواہد موجود ہیں''۔(۲)

فیض کی شاعری میں ریاستی جبر، سیاسی قید اور عدالتی ناانصافی کا نوحہ جابجا ملتا ہے۔ ان کا ہر شعر ان تمام پہلوؤں کا عکاس نظر آتا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے انہوں نے اس شعری پیرائے میں اپنے ذاتی تجربات کو بیان کیا ہے کیوں کہ انہوں نے اس قید و بند اور ریاستی جبر کا راولپنڈی سازش کیس میں عملی طور پر سامنا کیا تھا۔ انہوں نے عدالتوں کو بھی انصاف کا دامن چاک کرتے اور ناانصافی کو پروان چڑھاتے دیکھا۔ آمریت کی بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی، مگر اس کے بدلے بڑے سخت مراحل سے گزرنا پڑا اور ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ اس تناظر میں وہ لکھتے ہیں:

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں(۳)

نوتاریخیت کے مطابق ادب کو تاریخی تناظر سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل اور ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ شعر فیض کے اس سیاسی و سماجی شعور کا آئینہ دار ہے جو انہوں نے اپنے عہد کے استبدادی نظام، ناانصافی اور معاشرتی و طبقاتی استحصال کے خلاف ببانگ دہل پیش کیا۔ یہ شعر اس دور کی عکاسی کرتا ہے جب پاکستان میں آمریت، ریاستی جبر اور طاقت ور طبقوں کی اجارہ داری غالب تھی۔ فیض خود اس نظام کا شکار رہے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ انہوں نے دیکھا کہ جنہیں عدل و انصاف کا محافظ ہونا چاہیے تھا، وہی ظلم اور استحصال کے کارندے بن گئے۔

نوتاریخی تنقید میں طاقت اور سچائی کے تعلق کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اس شعر میں ''اہلِ ہوس'' وہ طبقہ ہے جو طاقت، دولت اور اقتدار کے بل بوتے پر انصاف کے تمام اداروں پر قابض ہے۔ وہی مدعی ہیں اور وہی منصف ہیں۔ یعنی وہی مقدمہ دائر کرتے ہیں اور ہی فیصلہ سناتے ہیں۔ اس سے عدلیہ، میڈیا اور قانون کے اداروں کی غیر جانب داری پر سوال اٹھتا ہے۔ فیضؔ یہاں نہ صرف عدالتی نظام پر تنقید کرتے ہیں بلکہ یہ دکھاتے ہیں کہ عام انسان کے پاس انصاف مانگنے کے لیے کوئی محفوظ راستہ باقی نہیں رہا۔ جب سب ادارے طاقت ور طبقے کے قبضے میں ہوں تو ایک مظلوم کس سے فریاد کرے۔ یہ سوال نوتاریخی تنقید کے مطابق فرد اور نظام کے درمیان طاقت کے غیر مساوی تعلق کی عکاسی کرتا ہے۔

نوتاریخیت کے مطابق کوئی بھی ادبی متن صرف ذاتی یا تخیلاتی اظہار نہیں، بلکہ تاریخی بیانیے کا حصہ ہوتا ہے۔ فیضؔ کا یہ شعر نہ صرف شخصی احساسات کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ ایک مخصوص سیاسی دور اور اس کے جبر کی

علامتی تصویر کشی بھی کرتا ہے۔ در حقیقت یہ شعر ایک نعرہ احتجاج ہے جو نوتاریخی تناظر میں طاقت اور انصاف کے بگڑے ہوئے توازن کو بے نقاب کرتا ہے۔ علاوہ ازیں! یہ شعر اس سیاسی نظام پر گہرا طنز ہے جس میں انصاف کا نظام استحصالی قوتوں کے قابو میں ہے۔ فیضؔ کے اس بیانیے میں ان کے عہد کی عدالتی ساخت، سیاسی پابندیاں اور نظریاتی جبر عیاں ہے۔

فیض نے محبت کو صرف شخصی یا رومانوی جذبے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے سماجی شعور اور جدوجہد سے جوڑ دیا۔ محبت کو علامتی طور پر بھی استعمال کر کے اپنے جذبات کی خوب ترجمانی کی۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا(۴)

یہ شعر فیضؔ کا معروف اور کثیر حوالہ دیا جانے والا شعر ہے۔ اگر اس شعر کو نوتاریخی تناظر میں پڑھا جائے تو یہ تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والے سماجی المیوں، بے گھر لوگوں، قتل عام اور مہاجرین کی حالتِ زار کے پس منظر میں پڑھا جائے تو یہ شخصی محبت کی بجائے اجتماعی دکھ اور سیاسی شعور کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر اکا ظاہری موضوع اگرچہ محبت اور وصل سے متعلق دکھائی دیتا ہے لیکن نوتاریخی تناظر میں اس میں سماجی اور سیاسی حالات کا عکس بھی جھلکتا ہے۔

اس شعر کا پہلا مصرع ''اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا'' اس وقت کی معاشرتی ناانصافیوں، سیاسی جبر اور سامراجی نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فیضؔ یہاں محبوب سے مخاطب ہو کر گویا پورے سماج سے مخاطب ہیں کہ صرف عشق اور جذباتی تعلقات ہی زندگی کا مقصد نہیں ہیں بلکہ معاشرتی دکھ، مظلوموں کی آواز، غریبوں کی فریاد اور محرومیوں کا بوجھ بھی سنبھالنا لازم ہے۔ جب کہ دوسرا مصرع ''راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا'' میں ''وصل کی راحت''، رومانوی محبت کی علامت ہے۔ لیکن فیضؔ یہاں اس سے بڑھ کر اجتماعی بھلائی، انقلابی کامیابی اور عدل وانصاف کی فتح کو اصل راحت قرار دیتا ہے۔

اس شعر کو تاریخی تناظر میں دیکھیں تو عیاں ہوتا ہے کہ یہ شعر ۵۰-۱۹۴۰ کی دہائی میں لکھا گیا، جب تقسیم ہند، مہاجرت، قتل وغارت، استعماری زخم اور سماجی بربادی عام تھی۔ ایسے میں رومانوی شاعری کو ایک وسیع تر کرب میں شامل کر کے فیض نے اسے اجتماعی درد اور قومی شعور سے جوڑا۔ اس دور میں ترقی پسند تحریک بھی

عروج پر تھی، جو ادب کو سماجی تبدیلی کا ذریعہ سمجھتی تھی۔ اس شعر میں محبت کا ذاتی دکھ، عوامی المیے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

فیضؔ کی نظم ''ہم دیکھیں گے'' سب سے معروف اور نوتاریخی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے زیادہ تر اشعار نہ صرف شعری حسن کا اعلیٰ نمونہ ہیں بلکہ نوتاریخیت کے تناظر میں دیکھیں تو اس میں سیاست، مزاحمت اور سماجی شعور کی گہری پرتیں بھی دکھائی دیتی ہیں:

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے (۵)

نوتاریخیت ادبی و غیر ادبی متون کو ان کے تاریخی، ثقافتی اور سیاسی پس منظر میں دیکھنے پر زور دیتی ہے۔ یہ اشعار اس وقت تخلیق کیے گئے جب پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی آمریت عروج پر تھی۔ یہ نظم جبر، ظلم اور آمرانہ طرزِ حکومت کے خلاف ایک علامتی اور مزاحمتی بیانیہ ہے۔ درحقیقت یہ اشعار محض شاعری نہیں، بلکہ ایک سیاسی اور سماجی بیانیہ ہیں جو مخصوص تاریخی حالات کا عکاس ہیں۔ یہ نظم جنرل ضیا الحق کی آمریت، سنسر شپ، مذہبی منافرت اور جبر کے خلاف ایک عوامی احتجاج بن کر ابھری۔ یہاں اسلامی علامات کو استعارہ بنا کر طاقت کے بیانیے کو چیلنج کیا گیا ہے۔ نظم کا تنقیدی مطالعہ بتاتا ہے کہ فیض کی شاعری طاقت اور علم کے گٹھ جوڑ کے خلاف مزاحمتی قوت رکھتی ہے۔

''ہم دیکھیں گے'' میں 'ہم' کا استعمال ایک اجتماعی شعور اور عوامی طاقت کی علامت ہے۔ فیضؔ نے ان اشعار میں اشارہ دیا ہے کہ ظلم کی حکومت ختم ہو گی اور عدل کا دن ضرور آئے گا۔ بعد کے مصرعوں میں مذہبی علامتیں جیسے ''جب تاج اچھالے جائیں گے، جب تخت گرائے جائیں گے'' استعمال کی گئی ہیں۔ مگر ان کا مطلب مذہبی شدت پسندی نہیں بلکہ انقلابی تبدیلی ہے۔ نوتاریخی نقطہ نظر سے یہ مذہبی استعارے فیضؔ نے شعوری طور پر آمریت کے خلاف استعمال کیے تاکہ عوام کے جذبات کو جھنجھوڑا جا سکے۔

نوتاریخیت کے مطابق ادب صرف ایک جمالیاتی سرگرمی نہیں بلکہ طاقت کے ڈھانچوں سے جڑا ہوتا ہے۔ فیضؔ کے اشعار طاقت ور اور مقتدر طبقوں کے خلاف ایک بیانیہ پیش کرتے ہیں۔ یعنی یہاں پر شاعر ادب کو طاقت کے خلاف مزاحمت کا ذریعہ بناتے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فیضؔ کی یہ نظم محض ایک شعری

تخلیق نہیں بلکہ ایک تاریخی مزاحمتی دستاویز ہے۔ اس کے اشعار سیاسی ظلم، عوامی جدوجہد، مذہبی علامتوں کے انقلابی استعمال اور اجتماعی شعور کی بیداری کی نمائندگی کرتے ہیں۔

فیض کی شاعری میں جیل کے تجربات کو جمالیاتی انداز میں بیان کیا گیا ہے، مگر اس کے پیچھے ایک تاریخی حقیقت بھی موجود ہے۔ درحقیقت فیضؔ کی شاعری محض ایک جمالیاتی تجربہ نہیں بلکہ تاریخ کا ایک زندہ اور مزاحمتی اظہار ہے، جس میں شاعر ایک فعال سیاسی کردار ادا کرتا ہے:

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے (۲)

یہ شعر صرف ایک علامتی شعر نہیں بلکہ ایک سیاسی حقیقت کا بیان ہے جو فیض کے مجموعی تخیل اور سیاستِ زبان کے محور میں آنے والے بنیادی موضوعات کو چند الفاظ میں کھول دیتا ہے۔۔ یہاں ''لوح و قلم'' کی چھن جانے والی متاع دراصل اظہار رائے کی آزادی پر پابندی ہے۔ اس سیاق میں شاعر ایک سیاسی مجرم کے طور پر ابھرتا ہے جو طاقت کے آگے جھکتا نہیں، بلکہ مزاحمت کرتا ہے۔ یہ شعر اس وقت کے تناظر میں لکھا گیا ہے جب فیضؔ کو سیاسی سرگرمیوں، ترقی پسند نظریات اور عوامی حق گوئی کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ قلم و قرطاس کی آزادی چھین لینا ایک سیاسی جبر اور ظلم کی علامت ہے، جو آزادی اظہار رائے اور ادبی خود مختاری پر حملے کی نمائندگی کرتا ہے۔

نوتاریخیت مزاحمت کے بیانیے کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ اس شعر میں شاعر صرف مظلوم نہیں بلکہ مزاحمت کی علامت ہے۔ جب طاقت نے قلم چھین لیا تو فیضؔ نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھنے کا عزم کیا یعنی وہ طاقت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے سے باز نہیں آئے۔ یہ رویہ نوتاریخیت کے مطابق طاقت اور مزاحمت کے بیچ جاری کش مکش کی عمدہ مثال ہے۔ تحریر صرف اظہارِ خیال نہیں بلکہ طاقت کی ایک شکل بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوح و قلم چھینی گئی کیوں کی ریاست جانتی تھی کہ قلم میں مزاحمت کی قوت ہے۔ فیضؔ نے اس کے جواب میں خونِ دل سے لکھنے کا اعلان کر کے یہ پیغام دیا کہ طاقت کتنی بھی سخت ہو، فکر اور سچ کو نہیں دبایا جا سکتا۔ درحقیقت مندرجہ بالا دونوں مصرعے بذاتِ خود ایک چھوٹی مگر کثیر الساختی دستاویز ہیں۔ فیض تاریخی نقصان (متاع لوح و قلم کا چھن جانا) کو صرف فقدان کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اسے ایک اخلاقی و سیاسی انتخاب میں بدل دیتے ہیں۔ نوتاریخیت متن کو اس کے مادی و سیاسی ماحول سے الگ نہیں رکھتی، یہاں فیض نے بھی اسی تعلق کو شعری قوت

میں بدل دیا ہے۔ اگر ہم فیض کی تمام شاعری کے سیاسی پس منظر کو ملحوظ رکھیں تو یہ شعر کالا قانون، استبداد یا آمریت کے زمانے میں اظہارِ رائے کی ممانعت کے خلاف ایک لطیف مگر شدید احتجاج بھی ہے۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں (۷)

مندرجہ بالا شعر فیض کی نظم ''صبحِ آزادی'' کا ہے۔ یہ نظم انہوں نے برِصغیر کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے فوراً بعد لکھی۔ پاکستان اور بھارت کو آزادی تو مل گئی، مگر یہ آزادی لاکھوں جانوں کی قربانی، مذہبی فسادات، جبری ہجرت اور معاشرتی انتشار کے زخموں سے داغدار تھی۔ پاکستان اس وقت سیاسی طور پر کمزور، انتظامی طور پر غیر مستحکم اور معاشرتی طور پر انتشار کا شکار تھا۔ بطور ترقی پسند شاعر اور صحافی، فیض نے آزادی کے دنوں میں خوشی کے ساتھ ساتھ کرب و اذیت کا وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا، جس نے اس نظم کو جنم دیا۔

یہ نظم آزادی کے خواب اور حقیقت کے درمیان پیدا ہونے شدید تضاد کو بیان کرتی ہے۔ نوتاریخیت کے تناظر میں یہ نظم صرف ایک ادبی تخلیق نہیں بلکہ اس عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ کا جیتا جاگتا دستاویزی ریکارڈ ہے اور اس عہد کے اجتماعی شعور، ناامیدی اور صدمے کا بیانیہ ہے۔ یہاں ''داغ داغ اجالا'' محض ایک شعری تلمیح نہیں، بلکہ ۱۹۴۷ کی صبحِ نو کا ایک تاریخی استعارہ ہے۔ آزادی کا جو خواب شاعر اور عوام نے دیکھا تھا وہ حقیقت میں ایک ایسے سورج کی مانند نکلا جس کی روشنی میں اندھیرے کے دھبے موجود تھے۔ نوتاریخی زاویے سے یہ مصرع آزادی کی سیاسی حقیقت اور عوامی مایوسی دونوں کو یکجا کرتا ہے۔

درحقیقت ''داغ داغ اجالا'' محض روشنی کی کمی نہیں بلکہ امیدوں کی کرچیاں اور خوابوں کا خون ہے۔ نوتاریخیت کے زاویے سے یہ استعارہ اس بات کی علامت ہے کہ آزادی کا سورج تو طلوع ہوا لیکن اس کی روشنی میں فسادات کا دھواں، بربادی کا اندھیرا اور انسانی جانوں کے نقصان کے سائے شامل تھے۔ یہ روشنی ایک سیاسی جیت تو تھی مگر اخلاقی اور انسانی سطح پر شکست کا پہلو لیے ہوئے تھی۔ یہ مصرع واضح کرتا ہے کہ یہ سحر جو صدیوں کی غلامی کے بعد آئی، دراصل پچھلی رات (استعمار، جبر اور فرقہ واریت) کے زخموں سے لت پت ہے۔ نوتاریخی مطالعے میں یہ تصور ابھرتا ہے کہ کوئی تاریخی لمحہ اپنی سابقہ سماجی اور سیاسی قوتوں سے کٹ کر نہیں آتا۔ آزادی کی صبح بھی نوآبادیاتی ورثے اور مذہبی تقسیم کے اثرات کو اپنے ساتھ لے آئے۔

مندرجہ بالا شعر کے دوسرے مصرعے میں فیض کا لہجہ ایک انقلابی امید اور اس کی شکست کے درمیان کھڑا نظر آتا ہے۔ عوام کو جس صبح کا انتظار تھا وہ طلوع نہیں ہوئی، بلکہ اس کے برعکس جو صبح آئی وہ خون، غربت اور بد اعتمادی سے لپٹی تھی۔ نوتاریخیت کے مطابق یہ متن اس وقت کے عوامی شعور اور طاقت کے مراکز (نوآزاد ریاست، قیادت اور عوام کے باہمی تعلقات) کے درمیان خلا کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ شعر بیک وقت آزادی کی سیاسی کامیابی اور انسانی المیے کی کہانی سناتا ہے۔ نوتاریخیت کے اصول کے مطابق فیض نے اپنے عہد کے بیانیے کو چیلنج کیا اور اس کے پیچھے چھپے تضادات کو نمایاں کیا۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آو کہ گلشن کا کاروبار چلے (۸)

یہ شعر ۱۹۴۰ کی دہائی کے سیاسی ماحول میں لکھا گیا، جب برِصغیر میں آزادی کی تحریک عروج پر تھی اور عوام ایک نئے سیاسی و سماجی نظام کے انتظار میں تھے۔ نوتاریخیت کے اصول کے مطابق متن کو اس وقت کے طاقت کے ڈھانچوں اور عوامی جذبات کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے۔ اس دور میں نوآبادیاتی غلامی، معاشی ناانصافی اور طبقاتی تقسیم جیسے مسائل غالب تھے۔ یہاں پر ''گل'' محض ایک پھول نہیں بلکہ خوش حال اور آزاد معاشرے کے استعارے ہیں۔ ''رنگ بھرنا'' اس بات کی علامت ہے کہ ایک نئے دور کی شروعات ہونے والی ہے جہاں معاشرتی عدل اور انسانی آزادی کا خواب پورا ہوگا۔ نوتاریخی نقطہ نظر سے یہ مصرع استعماریت کے اندھیروں کے بعد آنے والے روشن دور کی امید کا اظہار کرتا ہے۔

اسی طرح ''بادِ نو بہار'' نئے سیاسی اور سماجی حالات کی علامت ہے۔ یہ اس تاریخی لمحے کی طرف اشارہ ہے جب عوام کو محسوس ہوا کہ آزادی قریب ہے اور پرانا جبر ٹوٹنے والا ہے۔ اس تبدیلی کو نوتاریخی حوالے سے دیکھیں تو عیاں ہوتا ہے کہ یہ نوآبادیاتی طاقت کے خاتمے اور ایک نئے قومی وجود کے قیام کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ''چلے بھی آو'' سے مراد شاعر کی کسی کو آنے کی دعوت نہیں ہے بلکہ اس وقت کے عوامی شعور کو جھنجھوڑ رہا ہے اور کچھ کرنے کا سبق دے رہا ہے۔ دوسرے مصرعے کے آخری الفاظ ''گلشن کا کاروبار چلے'' قوم کی اجتماعی تعبیر کے عکاس ہیں۔ یہاں پر ''گلشن'' وطن یا سماج کی علامت ہے اور ''کاروبار چلنا'' اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قوم کی ترقی اجتماعی کوشش کے بغیر ممکن نہیں۔ ان الفاظ میں ایک سیاسی اور سماجی اشارہ بھی ہے کہ آزادی صرف ایک سیاسی نہیں بلکہ معاشی و سماجی بہبود کا نام ہے۔

اس شعر کے نوتاریخی مطالعے سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ آزادی کی تحریک کے ایک پرامید اور فعال مرحلے کی نمائندگی کرتا ہے اور اس میں سیاسی آزادی، سماجی مساوات اور عوامی شرکت کا بیانیہ بھی شامل ہے۔ یہ شعر نہ صرف اپنے دور کی عوامی امیدوں کا عکاس ہے بلکہ اس وقت کے سیاسی بیانیے میں عوامی کردار کو مرکزی حیثیت بھی دیتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نوتاریخیت کی روشنی میں فیض کی شاعری کو صرف جمالیاتی ادب کی بجائے تاریخی دستاویز، فکری مزاحمت اور سیاسی شعور کے بیانیے کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ان کے اشعار میں نہ صرف انفرادی جذبات ہیں بلکہ ایک پورا عہد بولتا ہے۔ جبر کی علامتیں، طبقاتی کش مکش، عوامی اضطراب اور آزادی کی تمنا شامل ہے۔ فیض ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے تاریخ کو صرف موضوع نہیں بنایا بلکہ ادب کے ذریعے تاریخ کو تشکیل دیا اور اسے بدلنے کی کوشش کی۔انہوں نے تاریخی شعور کو اپنی شاعری میں اس خوبی سے سمویا ہے کہ ان کا ہر شعر ایک سماجی دستاویز بن گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خلیق انجم، فیض احمد فیض (تنقیدی جائزہ)، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دلی، ۱۹۸۵، ص ۱۱۸

2. https://www.facebook.com/photo?fbid=3467715853498338&set=pcb.1003484177339289

۳۔ فیض احمد فیض، نقش فریادی، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۴۱، ص ۱۶۱

۴۔ ایضاً، ص ۸

۵۔ فیض احمد فیض، مرے دل مرے مسافر، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۸، ص ۲۴۱

۶۔ فیض احمد فیض، متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۳، ص ۳۷

۷۔ فیض احمد فیض، دستِ صبا، پیپلز پبلشنگ ہاوس، لاہور، ۱۹۵۲، ۸۷

۸۔ فیض احمد فیض، کلیاتِ فیض، پرویز بک ڈپو، دہلی، ۱۹۵۵، ص ۷۵

References

1. Khaliq Anjum, *Faiz Ahmad Faiz (Tanqeedi Jaiza)*, Anjuman Taraqqi-e-Urdu Hind, Nai Dilli, 1985, p. 118.
2. Facebook Photo Post, https://www.facebook.com/photo?fbid=3467715853498338&set=pcb.1003484177339289
3. Faiz Ahmad Faiz, *Naqsh-e-Faryadi*, Maktaba Urdu, Lahore, 1941, p. 161.
4. Ibid., p. 8.
5. Faiz Ahmad Faiz, *Mere Dil Mere Musafir*, Maktaba Daniyal, Karachi, 2008, p. 241.
6. Faiz Ahmad Faiz, *Mata-e-Lauh-o-Qalam*, Maktaba Daniyal, Karachi, 1983, p. 37.
7. Faiz Ahmad Faiz, *Dast-e-Saba*, People's Publishing House, Lahore, 1952, p. 87.
8. Faiz Ahmad Faiz, *Kulliyat-e-Faiz*, Parvez Book Depot, Dehli, 1955, p. 75.